درس ۸

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات
سورۃ التغابن کی روشنی میں

—— (۳) ——

ایمان کے عملی تقاضے

© rasailojaraid.c

اب ہم اللہ کے نام سے سورۃ التغابن کی آخری تین آیات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں یہ تاثر اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ "ایمان اور اس کے ثمرات و مقتضیات" کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سورت کے مضامین کی ترتیب اس اعتبار سے بڑی حسین ہے کہ اس کے پہلے رکوع میں ایمان کے تینوں اجزاء (ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی نہایت جامع وضاحت اور ان پر ایمان لانے اور انہیں حرزِ جان بنانے کی زوردار دعوت ہے۔

دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پانچ آیات کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ ان میں ایمان کے ثمرات اور مضمرات کا نہایت جامع بیان ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد تین آیات جن پر یہ سورۂ مبارکہ مکمل ہوتی ہے ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں' جنہیں تین اہم اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی (۱) تقویٰ (۲) سمع و طاعت اور (۳) انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کو قرض حسنہ دینا۔ آخر میں مضمون کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی چند صفات کمال اور اسمائے حسنیٰ کا بیان ہے۔ تو آیئے کہ پہلے ان آیات کا رواں ترجمہ ذہن نشین کرلیں۔

© rasailojaraid.c

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (آیات ۱۶-۱۸)

"پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان میں ہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو' یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی ہوں گے جو آخری منزل مراد کو پہنچ سکیں گے۔ اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا' اور اللہ قدردان بھی ہے اور نہایت علم والا بھی۔ وہ کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے' زبردست' صاحبِ حکمتِ کاملہ!"

جیسا کہ اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی سات آیات میں ایمان کے بنیادی اجزاء کا بیان تھا اور پھر کلمہ "فا" سے پرزور پیرائے میں دعوت ایمانی شروع ہوئی تھی' اسی طرح دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات و مضمرات کا بیان تھا اور اب پھر کلمہ "فا" ہی سے دعوتِ عمل شروع ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں تھوڑا سا غور کرنے پر ایک نہایت حسین ربط نظر آتا ہے کہ ایمانیات میں اولین ایمان ہے ایمان باللہ۔ للذا یہاں عمل کی دعوت اس بات سے شروع ہوئی کہ: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ "پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہاری حدِ استطاعت میں ہے" ــــــ گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں بلکہ امکانی حد تک' مقدور بھر۔ ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا' للذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا بیان ہوا "سمع و طاعت" کے حوالے سے جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول ﷺ کی ذات و شخصیت ہے۔ آخر میں ذکر تھا ایمان بالآخرت کا جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے' للذا تیسرے نمبر پر ذکر ہوا انفاق اور اللہ کو قرضِ حسن دینے کا!

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ا۔ تقویٰ

عام طور پر "تقویٰ" کا ترجمہ "خوف" یا "ڈر" کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ "تقویٰ" کے معنیٰ و مفہوم کی صحیح اور کامل ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک، خوفناک اور ڈراونی شے کا، تقویٰ سے یہ ڈر مراد نہیں۔ ایک خوف اور ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے، یعنی محبت بھرا خوف۔ یہ خوف تقویٰ کی کسی حد تک صحیح ترجمانی ہے۔ بغرضِ تفہیم مثال پیش خدمت ہے کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں یا آپ کے کسی کام سے ان کی دل شکنی ہو یا ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہو۔ گویا آپ اپنے والد کی ناراضی کے خوف سے جو ان کاموں کے ارتکاب سے احتراز کرتے ہیں جو انہیں ناپسند ہوں۔ پس آپ کے اس محبت بھرے خوف کو "تقویٰ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کے قلب اور ذہن پر ہر وقت یہ خیال مستولی رہے کہ میرے کسی قول اور میرے کسی عمل سے میرا خالق و مالک مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، اور اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہے کہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے رب کو پسند نہ ہو۔ یہ کیفیت، یہ طرزِ عمل، یہ رویّہ اور یہ اندازِ فکر تقویٰ کی اصل حقیقت ہے!

قرآن حکیم میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ میں تقویٰ کے ضمن میں یہ شدید تاکید آئی ہے کہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ....﴾ یعنی "اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے" ـــــ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ہی مضطرب اور پریشان ہو گئے تھے کہ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کا حق ہے، کون اختیار کر سکتا ہے!! بالکل ایسے جیسے کہ اللہ کی اتنی معرفت حاصل کرنا جتنی کہ اس کا حق ہے کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ رسولِ کامل اور عارفِ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ خود فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

"مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ" یعنی "(اے اللہ) ہم تیری بندگی نہ کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے' اور ہم تجھے پہچان نہ سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے"۔ تو اگرچہ آنحضورؐ کے بارے میں تو یہی گمان ہے کہ یہ کلمات آپؐ نے بربنائے تواضع ارشاد فرمائے' لیکن کسی بھی دوسرے انسان کے بارے میں تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ کی "کماحقّہٗ" معرفت کا حصول اس کے دائرۂ اختیار اور حدِ امکان سے خارج ہے! یہی معاملہ تقویٰ کا ہے۔ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کے تقویٰ کا حق ہے' یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے' اس لئے کہ اس کا تقاضا تو یہ ہو گا کہ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں' اور ہر وقت شعوری طور پر چوکنا اور چوکس رہیں کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کہیں اور کبھی کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہونے پائے جو اللہ کے کسی حکم یا منشاء کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس پر صحابہؓ کی تشویش بالکل بجا تھی۔ البتہ جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ "پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان اور حدِ استطاعت میں ہے" تب صحابہ کرامؓ کو تسکین حاصل ہوئی!

واضح رہے کہ یہی بات سورۃ البقرہ میں بھی ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ: ﴿ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ﴾ "اللہ کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتا مگر اس کی وسعت کے مطابق"۔ اور یہی اصول سورۃ المومنون میں بھی وارد ہوا ہے کہ: ﴿ وَلَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ﴾ "اور ہم کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتے مگر اس کی وسعت کے مطابق۔" البتہ اس مقام پر تھوڑا سا توقّف کر کے استطاعت' استعداد اور وسعت کے بارے میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہئے اور وہ یہ کہ کسی انسان میں کتنی استطاعت و استعداد اور وسعت و طاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلّف اور جوابدہ ہے' اس کا صحیح شعور و ادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا۔ بنابریں وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے اور دین کی جانب سے عائد ہونے والی مشکل اور کٹھن ذمہ داریوں سے خود کو بالکل ہی بری ٹھہرا لیتا ہے۔ حالانکہ اللہ جو فاطرِ فطرت ہے' انسان کا خالق ہے اور اس کا علم کامل ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

استطاعت، استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہر انسان کا اسی کے مطابق محاسبہ اور اور مواخذہ فرمائے گا۔ بلکہ اس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ ہم ع "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار!" کے مصداق اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں کہ جب دین اور نیکی کے کام کی بات ہوتی ہے یا تبلیغ و دعوت کی بات ہوتی ہے یا دین کے دوسرے عملی تقاضے اور مطالبے ادا کرنے کی بات ہوتی ہے تو ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں اس کی استطاعت و استعداد نہیں ہے۔ جبکہ دنیا کے معاملات میں ہماری جولانیاں اظہر من الشمس ہوتی ہیں اور ہماری توانائیوں، ہماری تگ و دو اور ہماری اہلیت و صلاحیت کا نتیجہ بھرپور طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ ایک فریب ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک شخص دنیا میں پھل پھول رہا ہے، اس کے جوہر نمایاں ہو رہے ہیں اور وہ دنیوی امور میں دوسروں سے آگے نکل رہا ہے اور ترقی پر ترقی کرتا چلا جا رہا ہے تو یہ استطاعت و استعداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ اس میں ذہانت، صلاحیت، قوتِ کار، وسعتِ عمل اور جذبۂ محنت و مسابقت موجود ہے، تب ہی تو وہ آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ لہٰذا صحیح روش اور درست رویّہ یہ ہو گا کہ بِرّ و تقویٰ کے تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں آگے بڑھنے کی شعوری طور پر اور امکان بھر کوشش کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رہنے دیا جائے اور اپنی امکانی حد تک نہ کوئی تساہل ہو اور نہ ہی کسی فراری ذہنیت کو بروئے کار آنے دیا جائے۔ البتہ یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس سب کے باوجود انسان اتنا ہی آگے بڑھ سکے گا جتنی اللہ تعالیٰ نے اس میں استطاعت و وسعت رکھی ہے، اگرچہ جب تک انسان اس کے لئے شعوری طور پر عزمِ مصمم کے ساتھ کوشش نہیں کرے گا اس وقت تک یہ ظاہر ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس میں وسعت، صلاحیت اور استطاعت کتنی ہے! رہا محاسبۂ اخروی کا معاملہ تو وہ یقیناً ہر شخص کی وسعت و استطاعت کی بنیاد ہی پر ہو گا جس کا صحیح علم اللہ کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا کہ کسی شخص نے اس وسعت و استعداد کے مطابق جو اسے دی گئی تھی دین کے مقتضیات و مطالبات پورے کرنے کی کس حد تک محنت اور کوشش کی۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

تقویٰ کے مفہوم کی بہترین تعبیر کے ضمن میں دورِ خلافتِ فاروقیؓ کا ایک بڑا عجیب واقعہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی محفل میں یہ سوال کیا کہ "تقویٰ" کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جو وضاحت پیش فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ :

> "امیر المومنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو جس کے دونوں اطراف میں خار دار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھل سنبھل کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اس احتیاطی رویّے اور بچ بچ کر چلنے کو "تقویٰ" کہتے ہیں۔"

فاروقِ اعظمؓ نے اس تعریف کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت اُبَیؓ بن کعب کو داد دی۔ حقیقت اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ اس دنیا میں ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بھی ایک سفر ہی ہے اور یہاں ہر چہار طرف گناہ، معصیت اور شہوات و لذّات کی نہایت خار دار جھاڑیاں موجود ہیں، چنانچہ ہر ہر قدم پر گناہ کی ترغیب ہے، معصیت کی تحریک ہے اور طرح طرح کے ظلم و اِثم اور طغیان و عدوان کی دعوت موجود ہے! اب اگر انسان ان جھاڑیوں سے بچ کر نکل جائے اور اپنے دامن کو ان میں الجھنے نہ دے اور اس دنیوی سفر کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرے کہ اس کے دامن پر معصیت کا کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے پائے تو اس روش، اس رویّے اور اس طرزِ عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایمان کا اوّلین تقاضا ہے!

۲۔ سمع و طاعت

تقویٰ کے تاکیدی حکم کے بعد اس آیت میں دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ "اور سنو اور اطاعت کرو"۔ اس سمع و طاعت کا تعلق بھی اصلاً تو ایمان باللہ ہی سے ہے، لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے، اس لئے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی

© rasailojaraid.com

تو اللہ ہی ہے' مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل "مطاع" بن کر رسول آتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی" ــــــ اور ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ رسول کی یہ اطاعت اصلاً مطلوب ہے "سمع و طاعت" کی شان کے ساتھ یعنی بلاچون و چرا اور بلاپس و پیش! اس بات کو پورے شعور و ادراک کے ساتھ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک اطاعت تو وہ ہوتی ہے جو آپ کے فہم' آپ کی سمجھ اور آپ کی پسند پر منحصر ہے' یعنی یہ کہ اگر کوئی حکم آپ کی سمجھ میں آگیا یا آپ کو پسند آگیا تو آپ نے مان لیا اور اطاعت کی روش اختیار کرلی اور اگر وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا یا آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ نے اطاعت نہیں کی بلکہ لاپروائی اختیار کی۔ اس رویّے اور طرزِ عمل کا تجزیہ کیجئے تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ یہ اطاعت اُس ہستی کی نہیں ہے جو حکم دے رہی ہے' بلکہ اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار اور عقل و منطق کی رُو سے یہ خود اپنی سمجھ یا اپنے جی کی اطاعت ہے' اور دونوں صورتوں میں آپ نے یا اپنی عقل کی' یا اپنے جی کی' یا اپنی پسند کی اطاعت کی ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تو اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ جو بھی حکم ملے' اس پر سرِ تسلیم خم کردیا جائے' جو فرمان بھی سامنے آئے بجالایا جائے' جس چیز سے روک دیا جائے اس سے رک جایا جائے! اور اگر ان اوامر و نواہی کی حکمتیں بھی سمجھ میں آجائیں تب تو کیا ہی کہنے ہیں' یہ تو "نورٌ علٰی نور" والی بات ہے' لیکن اگر کسی حکم کی غرض و غایت یا حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے تب بھی مجرد "سمع" یعنی سن لینے سے "طاعت" یعنی فرمانبرداری لازم آجاتی ہے!

عملی اعتبار سے اس "سمع و طاعت" کا نقطۂ آغاز نبی ﷺ کی ذات اور شخصیت ہے' اس لئے کہ آپؐ ہی پر وحی جلی کے ذریعے وہ حکمت عطا فرمائی گئی جس کی روشنی میں آپؐ نے اللہ کے کلام کی توضیح و تبیین اپنے فرامین و فرمودات کے ذریعے کی۔ اور اس کا عملی نمونہ اپنی سیرت و کردار اور اپنے افعال و اعمال کے ذریعے پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

انؐ کے بارے میں وضاحت کر دی گئی کہ : ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝﴾ "اور وہ (ہمارے رسولؐ) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو (ان پر نازل) کی جا رہی ہے"۔ اسی کی ترجمانی ہے فارسی کے اس شعر میں ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

گویا رسول ﷺ کے احکام ان کی خواہشات پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی وحی پر مبنی ہوتے ہیں۔ تمہارا ذہن، تمہارا فکر، تمہاری عقل اور تمہاری سوچ محدود ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی حکمت وعلّت تمہاری سمجھ میں آ جائے اور ہر حکم کی مصلحت تمہارے فہم کی گرفت میں آ سکے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت "سمع وطاعت" کی شان سے ہوگی، اور عقل انسانی کو ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اس پر کسی قسم کی حدود وقیود عائد کرے۔ البتہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی مسلمان ہیئتِ اجتماعیہ کے سربراہ یعنی کسی حاکم یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایسی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ ہر "اطاعت" کے ساتھ "فی المعروف" کی قید لازمی ہے۔ یعنی اب ہر اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) یعنی مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ البتہ "فی المعروف" کی پابندی اور مشاورتِ باہمی کا حق ادا کرنے کے بعد اسلامی معاشرے اور نظمِ جماعت میں درجہ بدرجہ ڈسپلن کی شان "سمع وطاعت" والی ہی ہونی چاہئے تاکہ معاشرہ اور ہیئتِ اجتماعی پوری طرح منظّم اور چاق وچوبند رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

زیر مطالعہ آیت کی تیسری اور آخری بات کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : ﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ﴾ "اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اسی میں

© rasailojaraid.com

تمہاری بھلائی مضمر ہے!" اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غرباء، فقراء، مساکین اور یتامیٰ کے لئے بھی ہے اور اللہ کے دین کے لئے بھی! اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ بڑا گہرا مگر لطیف تعلق ہے، اس لئے کہ جسے آخرت پر یقین حاصل ہو وہ جو مال اللہ کے لئے صرف کرے گا اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہو گا کہ یہ مال محفوظ ہو گیا، گویا اللہ کے بینک میں جمع ہو گیا۔ اب یہ بات بالکل ظاہر و باہر اور حتمی و یقینی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہتر حاصل آخرت کے بینک میں جمع کرا دیا ہو تو ایسے شخص کی کیفیت موت کے وقت بالکل وہی ہو گی جو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

© rasailojaraid.com

یعنی مردِ مومن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اپنے مال و دولت اور اپنی توانائیوں اور قوتوں کا بہت بڑا حصہ اللہ کے بینک میں جمع کرا رکھا ہے اور اب میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت، میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے نام سے اِس وقت جو کتابیں موجود ہیں، ان میں سے متی کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے کہ "اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو، جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری ڈاکے کا بھی خوف ہے بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے، نہ چوری کا خوف ہے، نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا"۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ بھی بڑا عجیب اور پیارا ہے، ان کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو سیدہ صدیقہؓ نے ایک دستی بچا کر رکھ لی اور باقی سارا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: مَا بَقِیَ مِنْھَا؟ یعنی "اس بکری میں سے کیا بچا؟"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا یعنی "اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک دستی کے"۔ اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: بَقِیَ کُلُّھَا اِلَّا کَتِفَھَا یعنی "پوری بکری بچ گئی سوائے اس دستی

© rasailojaraid.com

کے!" یعنی اس دستی کو تو ہم کھالیں گے اور جو کھالیا گیا وہ تو خرچ ہو گیا' البتہ جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا' وہ باقی رہنے والا ہے' وہ اصل بچت ہے۔ لہٰذا ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آنی چاہئے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا ہے وہ حقیقی بچت ہے۔ یہی تعلیم و تلقین ہے ان الفاظ مبارکہ میں ﴿وَاَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ﴾ "اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو' یہی تمہارے لئے بہتر ہے"۔

آگے متنبہ فرمادیا کہ اگر مال کی محبت تمہارے دل میں باقی رہی اور تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی رہی تو یہ بخل ہے: ﴿وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ﴾ "اور جو اس شُح سے' بخل سے' جی کے لالچ سے بچالیا گیا" وہی انفاق میں آگے بڑھ سکے گا' اور اس صورت میں وہ کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکے گا۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: ﴿فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝﴾ "پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔" فلاح کسی کے منزلِ مراد پر پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں واضح فرمادیا گیا کہ جو اس شُحِ نفس سے' مال کی محبت اور جی کے لالچ سے بچالیا گیا وہی آخری منزلِ مراد تک رسائی حاصل کر سکے گا!!

اگلی آیت میں انفاق پر ایک نہایت مؤثر اسلوب سے مزید زور دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعِفۡہُ لَکُمۡ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ﴾ "اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا۔" اللہ کی راہ میں اگر انفاق کیا جائے' خرچ کیا جائے' مال لگایا اور کھپایا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ہماری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کے لئے اپنے ذِمّے قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کی رضاجوئی کے لئے مال خرچ کرنے کی دو مدّات ہیں' ایک مد یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو صاحبِ احتیاج ہیں یعنی غرباء و فقراء' یتامیٰ و مساکین' بیوائیں اور ایسے لوگ جو کسی سبب سے معاشی جدّوجہد میں پیچھے رہ گئے ہیں ان کی مدد کی جائے' اور دوسری مد یہ ہے کہ اللہ کے دین کی نصرت کے لئے خرچ کیا جائے۔ یعنی اس کے دین کی نشرواشاعت اور دعوت کے لئے صرف کیا جائے اور دین حق کے غلبہ اور اقامت [illegible] ضروریات کی فراہمی پر صرف کیا جائے۔ اگرچہ قرآن مجید

©rasailojaraid.com
©rasailojaraid.com

میں اکثر و بیشتر مقامات پر ان دونوں مدّات کا ذکر مشترک انداز میں آتا ہے لیکن جا بجا ان کے لئے علیحدہ اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ پہلی مد کے لئے بالعموم "ایتاءِ مال" اور "صدقہ" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور دوسری مد کے لئے عموماً جہاد بالمال اور انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاحات اختیار کی جاتی ہیں' جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں: ﴿وَجَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ "اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔" اور اسی کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض سے بھی تعبیر فرماتا ہے' حالانکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے' جیسے کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے۔" اور کہیں ارشاد ہوا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "اور آسمانوں اور زمین کے جملہ خزانے اللہ ہی کے لئے ہیں"۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہمارے اس انفاق کو اپنی قدر دانی کے اظہار اور حوصلہ افزائی کے لئے اپنے ذمہ قرضِ حسن قرار دیتا ہے۔ پھر دنیا کے قرضِ حسن میں تو صرف رأس المال کے واپس ملنے کی امید ہوتی ہے اور کسی اضافے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لئے کہ یہاں قرض پر اضافہ سود ہے جو ہمارے دین میں مطلقاً حرام ہے۔ لیکن انفاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ کو جو قرضِ حسن دیا جاتا ہے اس کے بارے میں وہ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اسے بڑھاتا رہے گا اور اس میں اضافہ کرتا رہے گا۔ مزید برآں اس کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نہایت حسین و جمیل جوڑا آیا ہے اور اس میں قرآن کے عام اسلوب کے مطابق نہایت گہرا معنوی ربط ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝﴾ "اور اللہ شکور (یعنی قدر دان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔" یعنی اگر تم اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو' خرچ کرتے ہو تو وہ قدر افزائی فرمانے والا ہے' اور اس کے برعکس اگر بخل کرتے ہو' نفس کے شُحّ اور جی کے لالچ ہی میں مبتلا رہتے ہو اور اسی کا عطا کردہ مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' بلکہ مال کو سینت سینت کر رکھتے ہو تب بھی وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے کیونکہ وہ بڑا حلیم اور بڑا بردبار ہے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت بھی بڑی عجیب اور بہت پیاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ "(وہ اللہ) چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے، زبردست ہے، کمال حکمت والا!" آیت کے آخر میں پھر دو اسمائے حسنیٰ جوڑے کی صورت میں آئے ہیں، یعنی وہ "العزیز" بھی ہے اور "الحکیم" بھی۔ گویا ایک جانب اللہ غالب ہے، زبردست ہے، مختارِ مطلق ہے، اس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ الحکیم بھی ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر دیکھئے یہاں صفات و اسماء کے دو جوڑوں یعنی "شَكُورٌ حَلِيمٌ" اور "الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" کے درمیان اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان ایک نئی شان کے ساتھ آگیا۔ یعنی وہ غائب و حاضر چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب اہل ایمان، اصحابِ بِرّ و تقویٰ اور طاعت و انفاق پر کاربند رہنے والوں کے لئے بشارت اور یقین دہانی کا مظہر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے کامل غلبہ و اقتدار کا مالک ہے! اس لئے کہ وہ "العزیز" ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیئے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے، اس لئے کہ جہاں وہ "العزیز" ہے وہاں "الحکیم" بھی ہے۔ ۝۝

© rasailojaraid.com

بقیہ : لغات واعراب قرآن

اِلاَّ / بِاِذْنِ اللّٰهِ، بِاِذْنِ اللّٰهِ، بِاِذْنِ اللّٰهِ / وَيَتَعَلَّمُوْنَ (مثل سابق) مَايَضُرُّهُمْ / وَلَا، لَايَنْفَعُهُمْ / وَلَقَدْ، لَقَدْ / عَلِمُوْا، عَلِمُوْا / لَمَنِ، لَمَنِ / اشْتَرٰىهُ، اَشْتَرٰىهُ، اشْتَرٰىهُ / مَا / لَهٗ، لَهٗ، لَهٗ / فِى الْاٰخِرَةِ، الْاٰخِرَةِ، الْاٰخِرَةِ / مِنْ، مِنْ / خَلَاقٍ، خَلَاقٍ، خَلَاقٍ / وَلَبِئْسَ مَا / شَرَوْا، شَرَوْا / بِهٖ / اَنْفُسَهُمْ، اَنْفُسَهُمْ / لَوْكَانُوْا، كَانُوْا / يَعْلَمُوْنَ، يَعْلَمُوْنَ / وَلَوْ اَنَّهُمْ، اَنَّهُمْ / اٰمَنُوْا، ءَامَنُوْا، اٰمَنُوْا / وَاتَّقَوْا، وَاتَّقَوْا، وَاتَّقَوْا / لَمَثُوْبَةٌ، لَمَثُوْبَةٌ / مِنْ، مِنْ / عِنْدِ، عِنْدِ اللّٰهِ / خَيْرٌ۔ لَوْكَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (مثل سابق)

© rasailojaraid.com